میرے اُستاد — میرے رہبر

''تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے''

الیاس میراں پوری ☆

ہر انسان کی زندگی میں کچھ لمحے، کچھ پل اور کچھ گھڑیاں ایسی ضرور آتی ہیں جو اس کے لوحِ دل پر رقم ہو کر زندگی میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ یہ حوصلہ اور یہ جرات ہی ہوتی ہے جو انسان کو لایعنی مقاصد سے مجتنب اور محترز رکھتی ہے۔ مادیت پرست عصر حاضر میں انسانیت سے مملو نمود و نمائش کی آلائش سے کنارہ کش، فکر و نظر کی پاکیزگی، خیالات کی شفافیت اور اُجلا پن اور نرگسیت پسندی سے کوسوں دور رہنے والی شخصیات کے ساتھ ماضی میں گزرا ایک ایک لمحہ اتنا خوشگوار، خوبصورت، دلکش اور ناقابل فراموش ہوتا ہے کہ انسان کی تنہائی کا رفیق بن کر اُسے تنہا نہیں ہونے دیتا، لیکن کیا کیا جائے کہ ان خوبصورت لمحوں کے حصے میں بہت کم وقت آتا ہے اور بعض اوقات یہ قلیل وقت بھی پوری زندگی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ پھر ان یادوں کے سہارے زندگی کو دھکیلتا رہتا ہے۔

کیا ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کا سورج اس لیے طلوع ہوا تھا کہ اُسے خود تو غروب ہونا ہی تھا اور جاتے جاتے ہماری ساری خوشیوں، ساری راحتوں اور ساری امیدوں کو بھی غروب کر کے لامتناہی اندوہ ناک اور غم آلود لمحات دے جائے گا۔ یہ کیا ہوا اور اتنی جلدی کیوں ہوا۔ وہ غم اور وہ دکھ کیا تھا؟ ایک اندوہ ناک اور وحشت اثر خبر تھی، جس نے دل کو دہلا اور دماغ کو لرزا دیا۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔

اُس دن میرے مشفق، میرے مہربان، میرے محسن، میرے مربی، میرے استاد، میرے رہبر...... ذوالکفل بخاری عقبیٰ کو سدھار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی اچانک رحلت سے صاحبانِ علم و دانش اور اہلِ فکر و نظر میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ یہ صرف کسی ایک انسان کی موت نہیں بلکہ ایک ایسے ادارے کی موت ہے جس نے ہر مکتبہ فکر اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر اُس انسان کو صدمے سے دوچار کیا جو شعور و آگہی کا شناور ہے۔ ہم ایسے کم نصیبوں کی زندگی میں ایسا دن بھی آنا تھا کہ بہار جاتے جاتے دلوں کو خزاں آشنا کر جائے گی۔ خوشیاں روٹھ جائیں گی اور غم مسکراتا رہے گا۔ قلب و جگر کا وہ کونسا گوشہ ہے جو اس کرب و اذیت سے واقف نہیں ہوا۔ یہ ہمارے درمیان سے کون چلا گیا کہ اکابر و اصاغر مغموم اور ملول ہیں۔ اس موقع پر استاد جی کی نظم ایسے نہ کیا کرو کی چند لائنیں ذہن میں آ رہی ہیں:

☆ لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج مخدوم رشید (ملتان)

ایسے نہ کیا کرو
بیٹھے بٹھائے یاد آجاتے ہو
بالکل!
ایک دم!
جی تو اکثر اداس رہتا ہے
رات بے خواب سی گزرتی ہے
اور دن میں
اگلے پچھلے خواب ٹوٹا کرتے ہیں

وہ خوبصورت اور خوب سیرت شخصیت کے مالک تھے۔ حسن وخوبی کا کیا شاندار امتزاج تھا اور وہ اس میں یکتائے روزگار تھے۔

محبت، مودّت، انس، الفت، وابستگی، دلبستگی اور شگفتگی، وضعداری اور خلوص وشفقت کو اگر آپ کوئی نام دیں تو وہ ذوالکفل بخاری ہوگا۔ لیکن ان کی شخصیت ان کیفیات سے کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ تھی۔ حدِ وہم وایقان سے پرے، احساس و وجدان سے دور۔ اپنی الگ دنیا میں مصروف۔ خوشگوار اور ہنستی مسکراتی دنیا۔ وہ صرف ایک شخصیت نہ تھے بلکہ کئی شخصیات کا مجموعہ۔ کثیر الجہت، نجیب الطرفین، نابغۂ روزگار اور عبقری انسان۔ اُن کا نام آتے ہی میری آنکھیں اور دل احترام سے جھک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے لفظوں کو انھوں نے ہی انگلیاں پکڑ کر چلنا، بکھرے حروف کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے اور قرطاس کے مقدس چہرے پر سجانے کا درس دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں اُنہی کی بدولت ہوں۔ انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی کی۔ نہ صرف رہنمائی کی بلکہ ایک نصب العین دیا۔ میرا دل ہمیشہ ان کا شکر گزار رہے گا۔

میں نے استاد جی کی رہنمائی میں ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایف اے کرنے کے بعد میں تعلیم چھوڑ چکا تھا۔ جب استاد جی کو پتا چلا تو سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ بی اے کی تیاری شروع کرو۔ میں نے بہت عذر تراشے......لیکن اُن کا مربیّانہ اصرار میرے بہانوں پر غالب آ گئی اور میں نے بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ گرامیٔ قدر پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب بی اے میں ایک مضمون سیرتِ طیبہ میں میرے ٹیوٹر تھے جبکہ استاد جی نے مجھے انگریزی، اردو اور اقبالیات کی تیاری کرائی۔ انھوں نے اس سلسلے میں بڑی محبت، محنت اور شفقت سے مجھے پڑھایا۔ نتیجتاً میری بی اے میں فرسٹ ڈویژن آئی۔ اب انھوں نے مجھے ایم اے اردو کرانے کے لیے استادِ گرامی پروفیسر محمود الحسن قریشی مرحوم کی ''تحویل'' میں دے دیا۔ یہاں بھی وہ میری تعلیم کے لیے فکرمند رہے اور گاہے گاہے محمود صاحب مرحوم سے رپورٹ لیا کرتے تھے۔ میں نے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کچھ لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ دو۔ میں نے جب بھی کوئی مضمون لکھا اُنہی سے

تصحیح کراتا۔ وہ مضمون کی قطع و برید کے بعد مجھے سمجھاتے کہ کون سا جملہ اور کون سا لفظ، کس ادا کے ساتھ، کہاں آئے گا۔ اُن کی محنت رنگ لائی اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے بطور اردو لیکچرار میری تقرری ہوگئی۔ وہ اس وقت بیت اللہ میں تھے۔ میں نے فون پر اطلاع دی تو انھوں نے جس خوشی اور محبت کا اظہار کیا وہ میں زندگی بھر کیسے بھول سکتا ہوں! اُس میں خلوص اور شفقت کی لذت آمیز چاشنی تھی۔ استاد جی پاکستان آئے۔ مجھے گلے لگایا، مبارکباد دی اور کہا کہ میری خواہش پوری ہوگئی۔ درس و تدریس کے بارے میں مفید معلومات دیں۔ کالج میں پہلے روز کی ''کارروائی'' کے بارے میں دریافت کیا اور مزید ہدایات سے فیض یاب کیا۔ کالج کے پرنسپل جناب پروفیسر منیر احمد ابن رزمی سے مرحوم کی کافی موانست تھی اور اس تعلق کو انھوں نے تادم واپسیں خوب نبھایا۔ پھر مجھ سے ایک طویل مجلس میں گفتگو کرتے رہے۔ اُس نشست میں انھوں نے اپنے تدریسی تجربات و مشاہدات سے مستفید کیا۔ کچھ آپ بیتی کا تذکرہ اور کچھ جگ بیتی کا۔ اس ملاقات میں وہ جس طرح موتی رولتے رہے، میرا دامن تنگ تھا، لیکن اس تنگیٔ داماں کے باوجود میں نے بہت کچھ سمیٹا۔ کالج میں لیکچر کے دوران میری کوشش ہوتی ہے کہ استاد جی کا کوئی نہ کوئی قول، کوئی نہ کوئی شعر، کوئی نہ کوئی بات ضرور سناتا ہوں، اور آج ان کے بچھڑنے کے بعد صورتحال یہ ہے کہ اُن کا ذکر آتے ہی زبان ساتھ نہیں دیتی۔ الفاظ فضا میں کہیں معلق رہ جاتے ہیں اور

''اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے''

میں جب ماضی کے دریچوں کو وا کرتا ہوں تو یادوں کی ایک خوبصورت کہکشاں نظر آتی ہے، جس میں روشن ستارے جگمگا کر دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ ان کی ایک ایک یاد اور ایک ایک بات میری زندگی کا ایسا سرمایہ ہے جو مجھے کبھی مفلس نہیں ہونے دے گی۔ آج جب وہ ہم میں موجود نہیں (ہائے الفاظ کی کم مائیگی) ان کے خوبصورت خیالات میرے قلب و جگر کو گرما رہے ہیں۔ میں جب بھی کسی الجھن میں الجھتا ہوں، انھیں یاد کرتا ہوں، اسی وقت ان کی باتیں دل کے نہاں خانوں سے ظاہر ہوتی ہیں اور میرا مسئلہ سلجھ جاتا ہے۔ لیکن اس الجھن اور سلجھن کی کشمکش میں، میری کیفیت اُس بچے کی طرح ہوتی ہے جو بے یار و مددگار ہو۔ گویا نظیر اکبر آبادی کے اس شعر کے مطابق:

باغ میں لگتا نہیں صحرا میں گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

آج سے قریباً پندرہ سال قبل ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ اپنے دل موہ لینے والے انداز سے، گفتگو کے قرینے اور سلیقے سے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ سے (جو مرنے کے بعد تک اُن کے چہرے پر رہی)۔ ان کے چہرے پر شادابی اور طمانیت تھی۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے عالم استغراق میں کتاب کی ورق گردانی میں مصروف۔ میں عالم استعجاب میں انھیں دیکھتا رہا۔ اس دوران اُن کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ تعارف کرایا۔ انھوں نے جب مجھے اپنا نام بتایا تو میں کافی دیر تک اُن کا نام یاد کرتا رہا اور آخر کار کامیاب ہوگیا۔ یہ دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ میں دارِ بنی ہاشم پہنچا تو سب سے پہلے جس شخصیت سے میری ملاقات ہوئی وہ استادِ جی ہی تھے۔ انھوں نے جس طرح مجھ سے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا وہ

نا قابل فراموش ہے۔ ان کی محفل میں گھنٹوں بیٹھنے والوں کو بھی بوریت یا تکان کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ گفتگو کا سیلاب ہوتا جو بہتا جاتا۔ برجستہ اشعار، ضرب الامثال، روزمرہ ومحاورہ، مذہب، سیاست، ادب، سماج، تصوف، عالمی منظر نامہ غرض زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ ہے جو ان سے مخفی تھا۔ وہ جس موضوع پر بھی بولتے دلائل کے انبار لگا دیتے۔ تہہ در تہہ اور معنی در معنی باتیں نکلتی جاتیں اور ان باتوں سے بکھری خوشبو گرد وپیش کو معطر کیے دیتی۔ ان کی محفل میں ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں کی تسکین کے لیے وافر مواد ہوتا۔ بچوں میں ایسے گھل مل جاتے گویا اپنے بچپن میں واپس لوٹ گئے ہوں۔ نوجوانوں میں بیٹھے ہیں تو پورے فکری اور ذہنی شباب کے ساتھ۔ بزرگوں کے ساتھ نشست ہے تو ''بزرگی'' عود کر آتی تھی۔ ہر شخص سے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کر کے اُسے قائل کر لیتے۔ اُن کی ایک نمایاں خوبی (جو لوگوں میں خال خال ہی ہوتی ہے) یہ تھی کہ دوسروں کے مسائل کے حل کے لیے ذاتی دلچسپی لیتے اور اسے اس وقت تک سر پر سوار رکھتے جب تک کہ وہ مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔ مجھے ڈھونڈے سے بھی ایسا شخص نہیں ملتا، جس کو استاد جی کے وجود سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ہر ایک سے اخلاص بھرا تعلق تھا جو انمٹ اور لازوال رشتہ ہے۔ اس خوبی کو انھوں نے بطور خاص اپنی ذات کا حصہ بنالیا تھا۔ وہ تو گلاب کا ایسا پھول تھے جس کا مقصد صرف مہکنا ہے، یا ایسا سورج جس کی روشنی سب کو اُجالتی ہے۔ وہ خود دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ مخلص تھے تو کوئی کیسے اُن کے ساتھ مخلص نہ ہوتا۔ میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس ہوتے ہیں، میں اُن سے باتیں کرتا ہوں اور اُن سے رہنمائی لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ جس شخص کا نصب العین ہی خوشیاں اور مسکراہٹیں بکھیرنا ہو وہ سب کو دکھ کے پاتال میں کیسے اتار گیا۔ خود تو خلد مکیں ہو گئے لیکن اپنے محبت کرنے والوں کو اندوہ گیں کر گئے۔ لوگ جب بھی اُن کا ذکر کرتے ہیں تو میر تقی میرؔ کے الفاظ میں:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

استاد جی نے صرف ۴۰ سال عمر پائی۔ لیکن اس کم عمری میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ شاعری کی تو بڑے بڑوں کو حیرانی (اِسے ''پریشانی'' بھی کہہ سکتے ہیں) میں مبتلا کر دیا۔ نثر لکھی تو صاحبِ طرز ادیب کے معیار پر پورے اترے۔ تدریس کی تو کامیاب استاد ٹھہرے۔ کالم لکھے (اگرچہ بہت ہی کم لکھے) تو اس میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ صحافت کی تو نام پایا۔ روزنامہ خبریں کے ادبی صفحہ کے انچارج ہوں یا ہفت روزہ چٹان لاہور کے بیورو چیف، ٹیکنالوجی کالج ملتان کے مجلّہ صناع کے ایڈیٹر انچارج ہوں یا پھر سول لائنز اور ایمرسن کالج کے جرائد کی ادارت۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنی الگ شناخت بنائی۔ وہ ویسے بھی معاصرانہ چشمک سے دور رہتے ہوئے اپنی دنیا میں مگن رہتے تھے۔ دوست بنائے تو اس میں بھی انھوں نے اپنا معیار قائم رکھا۔ سب سے منفرد اور سب سے جدا۔ استاد جی کے دوستوں میں ''بزرگ'' بھی ہیں اور ''غیر بزرگ'' بھی۔ پروفیسر عابد صدیق، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر تاثیر وجدان، پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان، شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی، مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی، خالد مسعود خان، رؤف کلاسرا، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، مختار پارس، ڈاکٹر عبدالرب نیاز، شعیب ودود، ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان، محمد حامد سراج، قاسم بنگیال، چودھری عبدالرؤف، سجاد جہانیہ اور جمشید رضوانی اُن کے معروف دوستوں میں ہیں۔ آج یہ سب بے کراں اداسی اور بے کنار حزن وملال میں گرفتار ہیں۔ استاد جی اپنے دوستوں کے پاس بیٹھتے تو بعض اوقات پوری محفل

ہی ان کی سامع ہوتی۔ ان کے بعد جب ان کے دوستوں کی محفل جمتی ہوگی تو کتنی سونی، کتنی اداس اور کتنی ادھوری ہوگی۔ ان کے دوست اپنے اندر بہت بڑا خلا محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل فسردہ اور چہرے پژمردہ ہیں کہ اپنے عزیز ترین دوست کے بغیر زندگی کیسے گزاریں۔ انھوں نے سب کے غم بانٹے اور سب کو خوشی فراہم کی۔ اب ان کے مذکورہ دوستوں کے زخموں پر مرہم کون رکھے گا۔ کون ان کے دکھ درد بڑے غور اور بھرپور توجہ سے سنے گا۔ اور اب وہ کس سے مشورہ طلب کریں گے۔ ان کے دوستداران عزیز جب بھی ان کا نام لیتے ہیں ان کی آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں۔ میرؔ یاد آئے:

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اُنھوں نے میرے نام کے ساتھ ''میراں پوری'' کا لاحقہ لگایا۔ وہ کبھی کبھار مجھے ''علامہ میراں پوری'' بھی کہتے تھے۔ جب پہلی دفعہ حجاز مقدس گئے تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ اُن کے جانے کے بعد دل بہت غمزدہ تھا۔ اسی کیفیت میں، میں نے انھیں خط لکھا۔ عقیدت میں لکھے گئے بے ربط اور غیر موزوں الفاظ...... کچھ دنوں بعد اُس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُن کا مکتوب آیا۔ انھوں نے جس محبت کا اظہار کیا تھا وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اسی طرح ایک اور خط میں، میں نے اپنے دستخط ''ایجاد'' کرنے کے لیے درخواست کی تو فوراً جواب دیا اور دستخط سکھانے کے لیے انھوں نے پوری تفصیل اور نقشہ کے ساتھ سمجھایا۔ دستخط کے لیے کل ۱۷ مراحل بتائے۔ جب دستخط مکمل تیار ہوگئے تو آخر میں لکھا ''لیجیے میرے نزدیک ''محمد الیاس'' مکمل ہے۔'' خط کتابت کے علاوہ اُن سے اکثر بذریعہ ای میل بھی رابطہ رہا۔ ۱۶/مئی ۲۰۰۹ء کو اُنھوں نے مجھے ''دعائیہ ای میل'' بھیجی جو قبولیت کا درجہ اختیار کرگئی۔ ای میل کے الفاظ کچھ یوں تھے:

"May Allah make u a Professor soon."

وہ چونکہ ایک صاحبِ مطالعہ انسان تھے، اس لیے ان کے مطالعے کی وسعت تحریر اور تقریر ہر دو صورتوں میں عیاں تھی۔ ادب پر گفتگو ہو رہی ہے تو کلاسیکی ادب سے جدید ادب تک، مشرقی شعریات سے مغربی شعریات تک، اور یونانی فلسفہ سے عہدِ جدید کے فلسفیانہ افکار و خیالات اُن کے زبان سے تواتر سے جاری ہیں۔ مذہب زیرِ بحث ہے تو اس میں بھی بھرپور علمیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فقہی مسائل کو اس انداز سے بیان کررہے ہیں کہ سامع کو کسی بہت بڑے عالم دین سے ہم کلام ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ سیاست پر بات ہو رہی ہے تو دلائل و براہین سے پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے سیاست دانوں کے ڈھینڈے کھولتے جارہے ہیں۔ وہ اس وقت کسی بڑے تجزیہ نگار اور تیز نگاہ مبصر سے کسی طور کم نظر نہیں آرہے۔

قدرت نے ایک عبقری انسان کی مانند اُستاد جی کی طبیعت میں بھی شگفتگی، تروتازگی اور بذلہ سنجی بھی خوب خوب پیدا کی تھی۔ وہ بات سے بات نکالتے اور اسے لطیف وظریف انداز میں پیش کرکے اس میں مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کتاب کا ذکر ہو رہا تھا۔

میں نے کہا: ''کتاب اچھی طبع ہوئی ہے۔''

کہنے لگے: ''ہاں! اچھی تباہ ہوئی ہے۔''

اُستاد جی کو معروف نقاد اور محقق، مشفق خواجہ مرحوم سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ان کے کالم ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے مستقل قاری تھے۔ ان کے درمیان کافی عرصہ مراسلت رہی۔ مشفق خواجہ نے جب ان کی کثیر الجہتی کو دیکھا تو ایک مرتبہ جب وہ جھنڈیر لائبریری (میلسی) میں تشریف آئے تو لائبریری کے مالکان میاں مسعود جھنڈیر اور میاں محمود جھنڈیر سے کہا کہ مجھے ذوالکفل بخاری سے ملاؤ۔ میاں برادران، خواجہ صاحب کو استاد جی سے ملانے دارِ بنی ہاشم آئے تو خواجہ صاحب ان کی تنقیدی بصیرت، شعری اُپج اور وسعتِ مطالعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خواجہ صاحب زندگی بھر بہت کم لوگوں سے متاثر ہوئے، استاد جی کا شمار انہی لوگوں میں تھا۔ میں نے اُن کے اور خواجہ صاحب کے درمیان ہونے والی مراسلت کے خطوط برائے مطالعہ مانگے۔ وہ چونکہ نام ونمود سے کوسوں دور رہتے تھے، فرمایا کہ کیا فائدہ؟ اس میں کوئی خاص چیز نہیں۔ میرے اصرار (......یا پھر ضد) پر انھوں نے یہ خطوط منگوا کر عنایت فرما دیے۔ استاد جی سے اجازت لے کر میں نے اپنے لیے مکاتیب کی عکسی نقول محفوظ کر لیں۔ میں ''بخاری وخواجہ مراسلت'' کو گاہے گاہے پڑھ کر اُن کی منفرد و دلچسپ نثر سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ لیکن اس دوران ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن کیا کیجیے کہ ''جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی''

ان تاریخی نوادر میں سے کچھ قارئین کے لیے:

> تین دن پہلے آپ کا گرامی نامہ ملا۔ ''کھولا، دیکھا، پہچانا، اللہ اکبر! مولانا؟'' جی بہت خوش ہوا۔ ایک دم خوش! حضرت! یہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ ''ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں؟'' لیکن یہ جو مکتوب نگاری ہے، ہم واقعہ میں اسے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھا کیے۔ اور کبھی کبھار، بائیں کا نہیں تو دائیں کا سہی! اپنے تئیں ہم ادھر، بعض بندوں بلکہ بھائی بندوں کے وہ ناطقے بند کیے کہ انہیں پکارتے ہی بنی:
>
> گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
> کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے
>
> (ذوالکفل بخاری ۲۴/ نومبر ۱۹۹۳ء)

> ملتان کے پچھلے سفر میں آپ کی دل نوازی کا علم ہوا تھا اور اب کے یہ معلوم ہوا کہ آپ مسافر نواز بھی ہیں۔ آپ نے اپنا اتنا قیمتی وقت میرے ساتھ صرف کیا کہ آپ کے اس التفات کو میں اپنا حاصلِ سفر سمجھتا ہوں۔ آپ کے والد محترم اور برادرِ گرامی سے ملاقات کر کے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ میں نے آپ کو کچھ غیر طلبیدہ مشورے دیے۔ خدا کرے آپ پر اُن کا مثبت اثر ہو...... یہاں سے روانہ ہوتے وقت لوگوں نے مجھے ملتان کی گرمی سے بہت ڈرایا تھا، مگر آپ لوگوں کی وجہ سے اس شہرِ گرد وگرما میں خلوص کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔
>
> (مشفق خواجہ، ۲۷/ اپریل ۲۰۰۰ء)

مجھے نہ صرف اُن کی شخصیت نے متاثر کیا بلکہ اُن کی تخلیقات نے بھی مجھ پر خوشگوار اثر چھوڑا۔ ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ اُن کی تخلیقات محفوظ ہو جائیں۔ اور میں آئے روز اپنی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف بھی رہتا ہوں۔ اس

مرتبہ تعطیلات میں پاکستان آئے تو میں نے ان کی نظمیں کمپوز کر کے یک جا کر دیں۔ جنھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے:

''کیا ارادہ ہے؟''

میں نے عرض کیا:

''اسے کتابی صورت میں دیکھنے کی خواہش ہے۔''

یہ سن کر ہنس پڑے۔ مجھے جب بھی وہ خوشگوار مسکراہٹ یاد آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور بے چین و بے قرار رہتا ہے۔ بے سکونی، بے یقینی اور بے چینی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔ بہادر شاہ ظفر نے شاید اسی موقع کے لیے کہا ہوگا۔

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

اُنھوں نے مزید کئی نظمیں ''اوراقِ گم گشتہ'' میں سے ڈھونڈ نکالیں۔ میں نے یہ نظمیں بھی کمپوز کر لیں۔ اسی طرح میں اُن کے نثر پارے بھی محفوظ کرتا رہتا ہوں۔ چاہے وہ نقیبِ ختم نبوت میں مضامین ہوں، تبصرے یا دیگر رسائل و جرائد میں اُن کی تحریریں۔ میں ان کی تخلیقات کو کسی گوہر پارے سے کم نہیں سمجھتا، اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔

ایک مرتبہ میں نے اُن سے آٹو گراف کے لیے درخواست کی تو انھوں نے فرمایا:

''آٹو گراف کسی اہم شخصیت کا لیا جاتا ہے۔ میں کس شمار میں ہوں۔''

میں نے گزارش کی کہ میرے لیے آپ ہی اہم ہیں۔ کافی اصرار اور طویل انتظار کے بعد انھوں نے ۱۳/ اپریل ۱۹۹۹ء میں درج ذیل آٹو گراف مرحمت فرما دیا۔

> کامیاب آدمی وہ ہے کہ جو کوئی بھی کام کرنے سے پہلے، ایک لمحہ رُک کر، یہ سوچے کہ اس کام میں دین کا یا دنیا کا کیا فائدہ ہے۔ اگر کوئی فائدہ نظر نہ آئے یا کسی حقیر اور عارضی فائدے کی خاطر وقت، مال اور جان کی قربانی زیادہ محسوس ہو تو اُس کام کو فوراً ترک کر دے۔ اس کو ''ترکِ لایعنی'' کہتے ہیں۔ ''ترکِ لایعنی'' دنیا و دین کی کامیابی کا راز ہے۔

استاد جی کو حجازِ مقدس سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ پہلی مرتبہ اُن کا تقرر جب اُملج (منطقہ تبوک) ہوا تو انھیں زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ انھوں نے اس موقع پر فرمایا کہ میری خواہش تھی کہ حرمین شریفین کی ہمسائیگی نصیب ہو جاتی تو زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اس کے باوجود بھی وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے جمعۃ المبارک حرم میں ادا کرتے۔ اُن کے دل میں عشقِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عشقِ الٰہی ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ پیاسا کنویں کے پاس آنے کے لیے تڑپتا رہا۔ تشنگی بڑھتی رہی اور تشنہ لب کنویں کے قریب آتے گئے۔ اس دوران جب اُن کا تقرر حرم سے صرف پانچ سات منٹ کی مسافت پر اُم القریٰ یونیورسٹی میں ہوا تو اُن کی خوشی دیدنی تھی۔ انھوں نے جہاں بھر کی مسکراہٹوں اور پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا۔ اس لیے وہ ہر

وقت خوش رہنے لگے تھے۔ ان کی خوشی پر ہزاروں خوشیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ ان کا خمیر چونکہ اسی مٹی سے اٹھایا گیا تھا، اس لیے اسی مٹی میں واپس مل گیا۔

گویا جہاندار شاہ کے الفاظ میں

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء پیر کا دن ہے۔ دارِ بنی ہاشم میں ایک عجیب سا ماحول ہے۔ ہر طرف ایک پرسکون اداسی ہے۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر چہرہ افسردہ اور پوری فضا سوگوار ہے۔ یہ ساری کیفیت آنسوؤں میں ڈھل گئی ہے۔ پسماندگان صبر کا پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اور چپکے چپکے آنسو بہا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد استاد جی کے بزرگ دوست محترم ڈاکٹر اسلم انصاری تشریف لاتے ہیں۔ وہ شدید صدمے سے دوچار ہیں۔ بیس سالہ رفاقت اچانک ختم ہونے پر نوحہ کناں ہیں۔ کہتے ہیں میں وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو تعزیت کے لیے مخصوص ہیں۔ میری ہمت اور حوصلہ جواب دے گئے ہیں۔ میں جو پرامید تھا کہ علم و ادب کو ذوالکفل کی شکل میں ایک اچھا تخلیق کار مل گیا ہے۔ لیکن اب ...... کاش کاش اور صرف کاش...... ایسے شہ دماغ، مائیں خال خال جنتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انصاری صاحب فضا میں گھورنا شروع کردیتے ہیں، یادوں کو تازہ کررہے ہیں اور یادیں دل کو کچوکے لگا رہی ہیں۔

اُستاد جی پر اُن کے چاہنے والے بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور مزید لکھا جائے گا۔ میری یادیں محدود اور لفظ محدودتر ہیں۔ اُن کی ہستی کو چند لفظوں میں نہیں سمیٹا جاسکتا۔ میں اور کیا لکھوں۔ یادوں کا ایک سمندر ہے جو بہے جارہا ہے۔ آنسو ہیں جو تھمنے میں نہیں آرہے۔ میں نے یہ مضمون دل گرفتگی کی کیفیت میں لکھا ہے۔ میں نے جب بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی ہمیشہ ہمت ہار بیٹھا، الفاظ تتلیاں بن کر اُڑ گئے اور قلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ مضمون اُن کے شایانِ شان نہیں۔ یہ تو محبت کا ایک خوش نما رنگ ہے۔ یہ جو کچھ لکھا ہے آنسو ہیں جو الفاظ کی شکل میں قلم سے نکل کر قرطاس پر منتقل ہوگئے ہیں۔ میں پہروں ان کی یاد میں کھویا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جو گھڑیاں مجھے اُستاد جی کی صحبت میں میسر آئیں، وہ اتنی مختصر کیوں نکلیں؟ اور پھر جواب میں از خود غالبؔ کا وہی شکستہ شعر دہراتا ہوں کہ

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو شعلۂ برقِ فنا مجھے